۲۰

میرے دفتر میں ڈاک کا ایک تودا جمع ہو کر اپنے ہی وزن سے میز پر گر چکا تھا اور اس کے اندر سے انواع و اقسام کے خط جھانک رہے تھے۔ ایک لفافہ لمبائی میں کم اور چوڑائی میں زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ دونوں طرف بے شمار مہریں تھیں۔ کونے میں ہندوستان کا ٹکٹ چسپاں تھا اور لکھائی کافی مانوس سی تھی۔ میں نے خط کھولنے سے پہلے اسے سونگھا تو اس میں سے استاد بابلی کے ہاتھوں کی خوشبو آئی۔ وہ بالوں میں "کوٹی" کا تیل لگا کر دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کر لیا کرتے تھے۔ ململ کے کرتے کی آستینوں سے دن بھر ولایتی سینٹ کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

خط کھول کر دیکھا تو انہی کا تھا۔ اوپر لکھا تھا "ست نام سری واہگورو ست نام۔" نیچے السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکات۔ کے بعد لکھا تھا کہ ایک لمبے عرصے کے بعد تم کو خط لکھ رہا ہوں۔ شاید یہ میرا پہلا خط ہے۔ ہو سکتا ہے یہی خط آخری اور التمی ہو۔ گورو مہراج فرماتے ہیں کہ پریم مارگ پر اگامی سفر کرنے کے لیے برو برگ فراق اور فرقت خوراک کا درجہ رکھتے ہیں۔ پریمی سے جتنی دوری ہو گی اس قدر آنکڑا مضبوط اور کڑا ہو گا۔

اس مرتبہ میں بیساکھی کے میلے پر لاہور آ رہا ہوں۔ ایک سو بیس پریمیوں کا جتھہ ہے۔ گوردیال سنگھ ڈھلوی جتھے دار ہیں۔ میں ان کا نائب جتھے دار ہوں۔ تین دن لاہور میں رہیں گے۔ چوتھے دن حسن ابدال چلے جائیں گے' وہاں سے دو روز بعد واپسی ہو گی۔ پھر لاہور میں پورا ایک دن بسرام ہو گا۔ اگلے روز بعد دوپہر واہگہ کے راستے واپس۔ پر میں یہ سارا ٹائم تیرے ساتھ گزاروں گا اور تیرے پاس ہی رہوں گا۔ ہو سکتا ہے میں حسن ابدال بھی نہ جاؤں اور وہاں کے دو دن میں تیرے ساتھ لاہور ہی میں گزاروں۔ کچھ پتہ نہیں۔ آنے پر ہی حال خریت معلوم ہو گی اور آنے پر ہی اصل پروگرام بنے گا۔"

WWW.PAKS

وہ جس کیمرے کی میں نے تیرے سے فرمائش کی تھی' وہ ابھی تک نہیں مل سکا۔ ہندوستان میں ہر طرح کی امپورٹ بند ہے۔ خاص طور پر رنگ راس اور عیش آنند کی چیزوں کی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ پشاور میں کوئی باڑہ منڈی ہے جہاں سے ہر طرح کا سودا مل جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو لاہور اور حسن ابدال کے علاوہ اور کسی شہر میں جانے کی اجازت نہیں لیکن پچھلے یاتری بتاتے ہیں کہ بہت سے سودے راولپنڈی تک پہنچ جاتے ہیں اور میلے کے سے میں حسن ابدال میں بھی دکانیں ولایتی مال سے بھر جاتی ہیں۔ تم پتہ کر کے رکھنا شاید کوئی اچھا سا کیمرہ مل ہی جائے لیکن ہو جرمنی کا۔ یہ جو روسی کیمرے جرمن نقل میں بنتے ہیں' وہ نہیں لینا۔ روسی تو خود پاگل پٹھانوں کے ہاتھوں مار کھا رہے ہیں' ان کی مشینوں کا کیا اعتبار؟ گوردیال سنگھ کا بھتیجا جسونت پچھلی مرتبہ ایک روسی کیمرہ حسن ابدال سے خرید کر لایا تھا لیکن اس میں فلم ہی نہیں چلتی۔ ہر دو فریموں کے بعد پھنس جاتی ہے۔ بس تم پتہ کرنا اور ساری انفرمیشن اکٹھی کر رکھنا۔ باقی باتیں میرے آنے پر ہوں گی۔ جیسے جیسے یاد آتی جائیں گی' کرتے جائیں گے۔ جب حکم ہو گا' بجوگ والی ساہ پر واپس چلے جائیں گے' شاید اس بار لمبا ہی حکم ہو۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھنا' باقی سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ چوک بھی آباد اور خوشحال ہے اور لوگ بھی رجے پجے' سکھی اور بھاگوان ہیں۔ سب کا دعا سلام۔ قبول ہووے۔

تمہارا ورشن ابھلاشی
بھائی بالی گرنتھی

صدیوں بعد اپنے محبوب کا خط پا کر دل میں ٹھنڈک کی دھند اتر آئی۔ پر ان کے نام کے ساتھ گرنتھی کا لفظ دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ بندہ بھی کیا بے اختیار چیز ہے کہ اس کو ہر شے جب چاہے جیسا چاہے تبدیل کر کے رکھ سکتی ہے۔ اس شے میں طاقت ہو نہ ہو' بدھی ہو نہ ہو' ارادہ ہو نہ ہو' جاندار ہو چاہے بے جان' ٹھوس ہو چاہے مائع ہو' چاہے گیس۔ کیسی بھی حالت میں ہو' کسی بھی صورت میں بڑے سے بڑے بلوان کو بے دست و پا کر کے انگوٹھی میں سے گزار کر الٹا کے کھڑا کر دیتی ہے۔

پہلے مجھے انسان کی لاچاری اور بے اختیاری پر غصہ آتا تھا۔ پھر جب میں خود اس حال کا محرم ہوا تو سارا غصہ گلا دور ہو گیا۔ پہلے تو میں نے مجبور انسان کو گود میں اٹھایا۔ پھر اس کی انگلی پکڑ کر باغ کی سیر کرائی' اسے روش روش لے کر پھرتا رہا۔ جب سے اب تک میں اس کا

OCIETY.COM

خدمت گار اور بیٹ مین ہوں۔ اب وہ اپنی مجبوری اور لاچاری پر روتا نہیں۔ میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیتا ہے اور اس وقت تک چہرہ اوپر نہیں اٹھاتا جب تک کوئی دوسری آفت آ کر اس کے لٹو کی ڈور نہ گھما دے۔

جب ہم یاتریوں کے جتھے کی سواگت کے لیے واہگہ بارڈر پہنچے تو وہاں سب لوگ موجود تھے 'سوائے بھائی باہلی کے!

یاتریوں نے بتایا کہ ان کے کاغذ میں کوئی نقص رہ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جتھے میں شامل نہ ہو سکے۔ اب وہ ہوائی ایئر آئیں گے اور شام کی فلائٹ سے یہاں پہنچ جائیں گے۔ شکر ہے اس روز ایک فلائٹ آتی تھی۔

وقت مقررہ پر میں ایئرپورٹ پہنچا تو مجھے سیڑھیوں سے اترتے لوگوں کے گروہ میں اپنے گوہر مقصود کا چھریرا وجود نظر آیا۔ انہوں نے تنگ پائجامہ اور ململ کا کرتہ پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر نیلی پگڑی تھی۔ چمکتی دھوپ میں 'سیڑھی کے عین درمیان دائیں ہاتھ کو ہو کر انہوں نے ہاتھ باندھ کر پہلے لاہور کو دائیں طرف پرنام کیا' پھر بائیں طرف۔ پھر چہرہ اوپر اٹھا کر واہگورو اکال پرکھ سے کوئی بات کی اور آہستہ آہستہ سیڑھی سے نیچے اترنے لگے۔

جب وہ کسٹم کرا کر باہر نکلے تو انہیں دیکھ کر میرا رونا نکل گیا۔ پگڑی کے پیچھے سے ان کی الٹی کنگھی کے کیس نمایاں تھے۔ ہاتھ میں کڑا تھا۔ الٹے ہاتھ کی طرف چار پانچ انچ لمبی ایک کرپان ان کے پہلو میں لٹک رہی تھی۔ جسم جو پہلے ایک محبوب بھروئے کی طرح ذرا سا لچکیلا تھا' اب سیدھا' ستواں اور پراعتماد نظر آنے لگا تھا۔

میں ان کے راستے میں دونوں بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی رفتار تیز نہ کی۔ اسی طرح چلتے رہے اور میرے قریب پہنچ کر بیگ زمین پر رکھ کر مجھ سے ایسے چمٹ گئے جیسے اس کے بعد پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔

میں رونے کے ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتا ہوا جب ذرا تھما ہوا اور میری آواز قدرے اونچی ہو گئی تو انہوں نے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "بس بس۔ اس سنسار والکا کا یہی پھل ہے۔ اس کے ساتھ منور نجن ہو کر رہنا ہے اور اسی کی مہما کرنی ہے۔"

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح ان کے ساتھ چمٹا رہا۔ لوگ ہمارے ارد گرد سے گزرتے رہے اور حیران ہو کر دیکھتے رہے کہ ایک پاکستانی کو اس محبت اور

WWW.PAK

عقیدت کے ساتھ ایک سکھ کے حضور میں ایسی سسکیاں نہیں بھرنی چاہیے تھیں!

ان کو جب میں اپنی شوفر والی سرکاری گاڑی میں لے کر شہر کی جانب چلا تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "پاکستان بننے کے پورے سات سال پہلے میں نے لاہور دیکھا تھا' وہ بھی تین دن کے لیے۔ اب وہ تو یاد نہیں کہ کیسا تھا' یہ صاف نظر آرہا ہے۔"

میں نے کہا "سر لاہور اب بہت بڑا ہو گیا ہے اور ایشیا کے چند خوبصورت شہروں میں سے ایک گنا جاتا ہے تو انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا کہ ٹھیک ہے اور ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" پھر بولے "ہم نے تو تمہارے اسلام آباد کی بڑی تعریف سنی ہے' لوگ بڑی سوجھا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "جی وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا حسن باغوں' بہاروں اور پہاڑوں والا ہے لیکن اس کی ثقافت کوئی نہیں۔ نیا نیا آباد ہوا ہے۔ پانچ چھ سو سال بعد جا کر اس کے وجود کی ڈھلائی شروع ہو گی' ابھی تو کچا کچا سا ہے لیکن ہے خوبصورت!

پوچھنے لگے "اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا "اپنے گھر جا رہے ہیں جہاں میں آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔ وہ دل و جان سے آپ کے حسد میں مبتلا ہے اور کئی سال سے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

ہنس کر بولے "اس سے ضرور ملیں گے لیکن اس وقت میں ان کو سلام نہیں کر سکتا۔ مجھے حکم کے مطابق سیدھے پہنچنا ہے کہ یہی جتھے دار کا حکم ہے اور اس حکم کے تحت اس نے مجھے ایک دن لیٹ آنے کی اجازت بخشی تھی۔"

میں نے کہا "گھر سے چائے کی ایک پیالی پی کر سیدھے ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

کہنے لگے "ایسا ممکن نہیں۔ مجھے سیدھے ان کی سیوا میں حاضر ہو کر فتح بلانی ہے۔ پھر جیسا وہ حکم دیں گے' ان کی آگیا کا پالن کریں گے۔"

میں نے کہا "آدھ پون گھنٹے میں کیا فرق پڑ جائے گا؟"

کہنے لگے "بہت فرق پڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "فرض کیجیے جہاز دو گھنٹے لیٹ ہو جاتا پھر؟"

بولے "یہ دوسری بات ہے اور اس کا پر بھاؤ اور ہے۔"

میں نے کہا "پھر بھی میں آپ کو پہلے گھر لے کر جاؤں گا' پھر مڑھی رنجیت سنگھ پر چھوڑ کر آؤں گا۔"

OCIETY.COM

بولے "استاد کا نرنے پر حکم ہے' تم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔"

میں نے ڈرائیور سے کہا "گاڑی رنجیت سنگھ کی مڑھی کو لے چلو۔ بعد میں دیکھ لیں گے۔"

استاد گرامی نے فرمایا "شاباش! ٹھیک کیا۔"

ان کے اس فیصلے سے میں کچھ رنجیدہ سا ہو گیا تھا لیکن نہیں چاہتا تھا کہ ان کو میرے اس رویئے کا احساس ہو۔ میں نے کرید کرید کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر لیں جن میں زیادہ تر ان لوگوں کے حال احوال کی تفتیش مطلوب تھی جو میرے ان کے جانے پہچانے تھے۔

میں نے ان کو اس سکھ جوڑے کی تفصیل سنائی جو مجھے روم میں ملا تھا اور جس کی سردارنی بھائی بالی کی دل و جان سے عاشق تھی اور ان کے بیان بھاشن اور پاٹھ پر فریفتہ تھی۔ میں نے کہا جب بھی اس کا سردار ہم کو اکیلے چھوڑ کر کچھ لینے دینے جاتا تو وہ آپ ہی کا قصہ شروع کر دیتی اور بے حد افسردہ ہو کر رونے کے قریب ہو جاتی۔

کہنے لگے "عورتیں عام طور پر جذباتی ہوتی ہیں اور ان کی سوچ کا دائرہ شوک سوگ کے اندر ہی رہتا ہے۔ جو وجود ماتا کے رس سے بنتا ہے' وہ کشٹ میں ہی جیون بتاتا ہے۔ اس لیے ہر عورت دکھ دائی زندگی بسر کرتی ہے۔"

میں کیا کہنا چاہتا تھا اور وہ کدھر کو لے گئے۔

پھر میں نے ان کو بتایا کہ وہ نوجوان جس نے ایک مرتبہ بھائی گور بخش سنگھ کی دکان سے حمائل شریف چرائی تھی اور لوگوں نے پکڑ کر چوک میں اسے پھینٹی چڑھائی تھی' وہ آج کل واپڈا کا ایک بہت بڑا افسر ہے اور مجھے اکثر ذکر کی محفلوں میں ملتا رہتا ہے۔

استاد صاحب نے کہا "بس ہم دونوں سے پورے جیون میں ایک ہی نیکی کا کام ہوا اور ہم اس گدڑ پروانے کے زور پر گیٹ پاس کر سکتے ہیں۔"

پھر وہ مجھ سے اس کا احوال پوچھنے لگے۔ اس کے گھر بار' بال بچوں اور آر پردار کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ اس کے بڑے بزرگوں خاص طور پر اس کے ماموں کی بابت پوچھا تو میں کوئی جواب نہ دے سکا لیکن انہیں یہ یقین دلایا کہ ایک روز ہم ان سے جا کر ملیں گے اور وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

فرمانے لگے "نہیں بھئی نہیں۔ میں ان سے ملوں گا بھی نہیں۔ آخری ملاقات کوئی خوشگوار اور روچک نہیں تھی' اس لیے میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گا۔"

WWW.PAKS

میں نے کہا "کیوں؟"

بولے "شاید وہ مجھے دیکھ کر شرمندہ ہوں اور ان کو وہ سارا وقوعہ یاد آجائے۔"

میں نے کہا "میں بھی تو ان سے ملتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر تو وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ خوش ہی ہوتے ہیں۔ پھر ملنے کی کی آرزو کرتے ہیں۔ گلے لگا کر رخصت کرتے ہیں۔"

کہنے لگے "تمہاری اور بات ہے۔ تم نے اس وقت ان کی کم مدد کی تھی۔ میں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان کی سہائتا کی تھی۔ بھرپور مدد کرنے والے کو بھکاری پسند نہیں کرتا۔ لابھ اٹھانے والا جتور سے آنکھیں چراتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو کوئی منطق نہ ہوئی اور آپ کی بات میرے دل کو نہیں لگی..... شاید کوئی اور وجہ ہو جس کا ذکر آپ مناسب نہیں سمجھتے۔"

دکھی سے ہو کر بولے "اس وقت میں ان کا دھرمی ساتھی تھا۔ ہم سب ایک تھے۔ اب میں ایک اوپرا سا منکھ ہوں' آپ کے ساتھ کا نہیں۔ جو بھی مجھ سے ملے گا' ہزاروں سوالوں میں گھرا ہوگا۔ لوگوں کو شانت رکھنا چاہیے' اشانت نہیں۔ یوں بھی ملنے ملانے میں کیا رکھا ہے۔ بس سارا کھیل تماشا ہے۔ اصل حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں۔"

تھوڑی سی دیر میں ہم رنجیت سنگھ کی مڑھی پر پہنچ گئے۔ سارے یاتری اندر میں جمع تھے اور بھوگ ڈالا جا رہا تھا۔ دو مقامی گرنتھی گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہے تھے اور باہر سے آئے ہوئے سکھ اور سکھنیاں بڑی شردھا کے ساتھ پاٹھ سن رہی تھیں۔ کچھ لوگ باہر صحن میں اور برآمدوں میں کھڑے تھے اور بے معنی قسم کے انتظامی امور کی گتھلیاں سلجھا رہے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پشاور' دیر' سوات سے آئے تھے اور ان کے ساتھ افغانستان کے سکھ بھی شامل تھے۔ یہ آپس میں پنجابی بولتے تھے لیکن جب کسی بات پر چھیڑ پڑ جاتے تو خوفناک قسم کی پشتو بولنا شروع کر دیتے۔ افغانستان کے فارسی بولنے والے سکھ نرم دل' نرم رو اور نرم گفتار تھے لیکن ان کی بیویاں جب گھڑی کی رسی کھول کر مطلوبہ شے برآمد نہ کر سکتیں تو وہ بھی دوسرے سکھوں جیسے ہو کر اونچے اونچے بولنے لگتے اور فارسی کے بجائے پشتو میں دھکے مارنے شروع کر دیتے۔

اتنے سال بعد اتنے سارے سکھوں کو اکٹھا دیکھ کر مجھے اپنا لڑکپن اور جوانی کا زمانہ یاد آگیا۔ میں نے یہ سارا وقت سکھ گھروں اور سکھ گھرانوں میں گزارا تھا۔ ان کے بڑے بزرگوں سے ہر طرح کی سکھشالی تھی اور ان کی عورتوں کی نرم مزاجی سے بڑے فائدے

OCIETY.COM

اٹھائے تھے۔ پھر اچانک پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت انہوں نے سارے پرانے تعلقات پر لکیر پھیر کر انہی لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا جنہیں انہوں نے اپنی گود میں بٹھا کر چوریاں کھلا کھلا کر پالا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کو اپنے شہر میں اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ان کو بخش دیا جائے یا ان سے پرانے کرموں کا بدلہ لے کر اسی وقت نیست و نابود کر دیا جائے۔

بھائی باہلی کو بہت سی سکھنیوں نے پہچان لیا اور وہ بھاگ کر ہمارے گرد جمع ہو گئیں۔ ان کے ساتھ کچھ مرد بھی تھے جنہوں نے بھائی باہلی کے بارے میں سن رکھا تھا مگر انہیں دیکھا نہیں تھا۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر میرے استاد سے بینتی کی کہ وہ انہیں دھارمک بھاشن دیں اور سری گورو گرنتھ صاحب سے گرنتھ کنڈ کی کوئی بانی سنائیں۔

بھائی باہلی نے کہا "اس وقت اندر کھنڈ پاٹھ ہو رہا ہے اور ایسے وقتوں میں دھارمک بھاشن کا کوئی سے ہی نہیں چاہے گرنتھ کنڈھی سے ہی کیوں نہ ہو۔" لیکن انہوں نے استاد مکرم کی کوئی بات نہ مانی اور جھوم جھوم کر احتجاج سا شروع کر دیا۔ اس احتجاج میں عورتیں پیش پیش تھیں اور استاد صاحب کو دونوں بازو پکڑ کر آگے کو کھینچ رہی تھیں۔ وہ نہ نہ کرتے ہوئے بڑی آہستگی کے ساتھ ان کی کھینچ میں لپٹے چلے آ رہے تھے اور بڑی شریفانہ سی مزاحمت کر رہے تھے۔

بزرگ سکھ کہہ رہے تھے "بس پنج منٹ کی بات ہے۔ اس برامدے میں کھڑے ہو کر آپ کی بات سن لیں گے اور من پر سن کر لیں گے۔ روز روز تو آپ کے درشن ہونے نہیں اور روز روز آپ نے ملنا نہیں۔ ایک بار سن توش ہو گیا تو یہ کوڑا پرادلا سے بھرا جنم سپھل ہو جائے گا۔ آپ کا کچھ جانا نہیں، ہماری زندگی بن جانی ہے۔"

عورتوں نے ان کو برآمدے میں لا کر کھڑا کر دیا اور چار پانچ بڑی عمر کی خوبصورت سکھنیوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر نعرہ مارا "واہگورو کا خالصہ واہگورو کی فتح۔" مردوں نے اپنی بھاری اور گھمبیر آواز میں کہا "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال۔"

بھائی باہلی گرنتھی اپنے صاف شفاف کھدر کے پاجامے اور کھدر کے چست کرتے میں ان کی طرف بڑھے اور برآمدے کے ستون کے ساتھ ڈھونگا کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے تو ان کے بودے کھلے ہوا کرتے تھے اور کندھوں تک آتے تھے، پھر انہوں نے گیسو رکھ لیے اور بڑے کنگھے کے بجائے چھوٹی کنگھیوں سے گیسو سنوارنے لگے لیکن اب ان کے سر پر نیلی

پگڑی تھی جس نے ان کے کیسوں کو مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ یہ پگڑی کلف لگی نہیں تھی۔ اکالیوں کے انداز کی تھی لیکن اس کا رنگ گہرا نیلا نہیں تھا' بس نیلا تھا۔ اس رنگ میں ان کی اپنی مرضی شامل تھی۔ اس کی کوئی دھارمک وجہ نہیں تھی۔

انہوں نے ستون کے ساتھ ڈھولگا کر پہلے تو ہاتھ باندھ کر اوپر کی طرف اشارہ کیا' پھر بندھے ہوئے ہاتھ یاتریوں کی طرف گھما کر سب کو پرنام کیا۔ کچھ مرد اور عورتوں نے اونچی آواز میں کیرتن کا کوئی شبد اٹھایا لیکن ان سب کی آواز بھائی بالی گرنتھی کی واضح اور شفاف آواز میں ڈوب کر رہ گئی۔

پہلے انہوں نے اسی طرح ہاتھ باندھے الحمد شریف کی قرات کی اور پھر گورو گرنتھ صاحب سے محلہ ایک کی اشپدیاں سے راگ مارو کا انتخاب کیا۔ یہ گورو نانک دیو جی کا کلام تھا اور اپنے بچن بیان کی بدولت بہت اونچے درجے کی چیز تھا۔ راگی اور ربابی اسے ہارمونیم اور طبلے کی سنگت کے بغیر نہیں گاتے تھے لیکن میرے مرشد کو اللہ نے ایک ایسے کمال سے نوازا تھا جس کا کوئی نام تو نہیں تھا البتہ اس کے اندر گن سارے موجود تھے۔ ماری' روحانی' نفسی' خلقی' ترلوکی' جمالی' جادوئی' فلکی' نہی اور فریادی۔

انہوں نے مدھم تہہ کی پکار میں کہا:-

بکھ بوھتا لادیا دیا سمندھ منجھار
کندھی وس نہ آوئی نہ آرا نہ پار
ونجھی ہتھ نہ کھیونو جل ساگر آسرال
بابا جگ پھاتا مہاجال
گور پرساری ابرے سچا نام سنبھال

کہنے لگے یہ شری گورو نانک صاحب پہلی بادشاہی کا شبد ہے۔ آپ دنیا کی اوستا بیان کرتے ہیں' سننے اور بچارنے کے لائق مضمون ہے۔

مہاراج جی فرماتے ہیں کہ اس دنیا کا ہر ایک جیو من روپی کشتی میں بیٹھا ہوا ہے لیکن جب تک روح پار برہم میں نہ جائے' تینوں گن' تینوں شریر پچیس پر کرتی' من' مایا سے آزاد نہیں ہوتی۔ اس وقت روح من کے ماتحت ہے۔ ہم رشتے ناتے اور دنیا کے کام من کے کہنے پر کرتے ہیں۔ گویا ہم من کے کہنے پر سنسار سمندر میں بہتے جا رہے ہیں۔ سمندر کیسا ہے جس کا نہ ورے کا کنارا صحیح ہے نہ پرے کا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا یہ دنیا کب سے بنی ہے۔ کئی پرلے'

OCIETY.COM

مہا پرلے ہوئیں اور کئی ہوں گی۔ گورو نانک صاحب فرماتے ہیں:-

"تھت وار وناجوگی جانے' رت ماہ نہ کوئی + جا کرتا سرشٹی کو ساجے آپ جانے سوئی"

یعنی نہ جوگیوں کو پتہ ہے نہ کسی اور کو پتہ ہے جس مالک نے یہ سرشٹی بنائی ہے' وہی جان سکتا ہے۔ ہم یہاں کروڑوں جگوں سے آئے ہوئے ہیں۔ اگر راستہ ملا ہوتا تو یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔"

گورو نانک جی مہاراج فرماتے ہیں کہ دنیا کے جہازوں کے ساتھ کپتان ہوتے ہیں۔ دریاؤں والی کشتیوں کے ساتھ ملاح ہوتے ہیں جو بانس ڈال کر دیکھ لیتے ہیں کہ پانی کتنا گہرا ہے مگر ہماری کشتی کے ساتھ نہ کوئی ملاح ہے' نہ ملاح کے ہاتھ میں بانس ہے۔ کروڑوں جگ ہو گئے' ہماری کشتی 'سنسار' سمندر میں ڈگمگاتی پھرتی ہے۔ اگر ادھر سے ہوا آئی' ادھر چلی گئی۔ ادھر سے ہوا آئی' ادھر چلی گئی۔ کروڑوں جگ بیت گئے۔ بے شمار قوموں کی قومیں' مذہبوں کے مذہب اس میں غوطے کھا رہے ہیں۔ وچار کر دیکھو

بابا جگ پھاتا مہا جال

گورو نانک دیو جی فرماتے ہیں کہ افسوس کل عالم مہا جال میں پھنسا ہوا ہے۔ رحم کون کھاتے ہیں؟ جو اس جیل خانے سے نکل کر واہگورو سے مل چکے ہوں۔ وہ واہگورو کے بھیجے ہوئے آتے ہیں اور ہم پر ترس کھاتے ہیں اور آکر بتاتے ہیں کہ:-

گور پرسادی ابرے سچا نام سمھال

یعنی وہ آکر یہ سمجھاتے ہیں کہ بھائی تیرے اندر سچا نام ہے۔ تو کچھ نہ کر' نہ قوم چھوڑ' نہ مذہب' نہ کام کاج چھوڑ' نہ بال بچے چھوڑ۔ بس اپنے آپ کو اس سچے نام کے ساتھ جوڑ دے..... اب سوچو سچا نام کون ہے؟ ہر مذہب' ہر قوم اور ہر فرقہ اپنے اپنے نام کا دعویٰ کرتا ہے۔ کوئی اسے کلام الٰہی اور بانگ آسمانی کہتا ہے۔ کوئی اسے "ورڈ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بھگوان' رام کہتا ہے لیکن خود خدا اور سچا نام اندر ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ملتا کیونکہ ساری خدائی نے آنکھوں کے پیچھے پردہ لگا کر اسے باہر نکالا ہوا ہے لیکن جب تک گورو کے پاس نہیں جاؤ گے' کچھ نہیں ملے گا۔ گورو کے ساتھ ہو تو اندر جانے کے لیے اور شہ رگ تک پہنچنے کے لیے سیدھی جرنیلی سڑک ہے۔ گورو تیار ہے۔ وہ کہتا ہے اکیلا نہ جا' میں تیرے ساتھ چلوں گا۔ بس تو دروازے چھوڑ دے' میں تیرے ساتھ ہوں' تیری رہنمائی کروں گا اور تجھے نام کے ساتھ جوڑ کر آؤں گا۔ یہ نام کیا ہے؟ اس کا جن سادھارن سے کیا ناتہ ہے اور

گورو نانک دیو جی اس نام کو کیا ماستادیتے ہیں؟

سب نے اونچی آواز میں سریلے انداز اور یقین کی لے میں کہا:

نانک نام جہاز ہے چڑھے سو اترے پار

پھر میرے استاد نے میری طرف دیکھا۔ میں سامنے کی دیوار سے ڈھو لگا کر بیزاری کے انداز میں کھڑا تھا اور مسلسل ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ آج کی بات نہیں تھی' پہلے دن کا قصہ تھا۔ جب میں نے ان کو اپنے چوبارے پر کلارنٹ بجاتے سنا تھا اور میں بے اختیار ان کی سیڑھیاں چڑھ کر آدھے راستے میں کھڑا ہو گیا تھا۔

مجھے ان کی باج تو صاف سنائی دے رہی تھی' ان کا ایک طرف کا پہلو بھی تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں لڑکی ہوتا تو ماسٹر بالی سے شادی کر لیتا یا ان کو ادھال کر اپنے ساتھ کسی اور ملک میں لے جاتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کیفیت صرف میری ہی نہیں تھی' وہاں کی جتنی دلفریب اور دلدار قسم کی لڑکیاں تھیں اور جو راہ چلتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے اونچا ٹھٹھول کرتے گزرتی تھیں' ان سب کے دل میں اس کرشن کہنیا کی ایسی ہی مورت تھی۔

مرد گن وان ہو' ستواں ہو۔ سیدھی راہ چلتا ہو۔ عورت پر لہلوٹ نہ ہوتا ہو' سفید کپڑے پہنتا ہو۔ تیز خوشبو نہ لگاتا ہو۔ مخیر اور کھلے دل کا ہو' جھینپو نہ ہو۔ الائچی کا چھلکا چباتا ہو۔ مونالیزا جیسی مسکراہٹ رکھتا ہو۔ کسی کے آواز دینے پر رک جاتا ہو۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا ہو۔ ثابت قدم' دست گیر اور دوست رس ہو۔ تاک جھانک کا عادی اور نشے کا متلاشی نہ ہو۔ ایسے مرد پر عورت ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتی ہے اور اس کا نقشہ مرتے دم تک اس کے ذہن سے معدوم نہیں ہوتا۔

مجھے پتہ نہیں کب تک ان کا بھاشن ہوتا رہا اور کب تک مرد عورتیں' بوڑھے بچے ان کی سنگت میں گرد آلود فرش پر بیٹھے رہے۔ جب میں نے اپنے لمبے خواب سے نکل کر ان کی طرف دیکھا تو گہری شام ہو چکی تھی اور وہ آخری جملوں میں راگ مارو محلہ ایک سماپت کر رہے تھے۔

ان کا بھاشن ختم ہونے پر سب نے مل کر ایک زوردار نعرہ لگایا۔ واہگورو جی کا خالصہ واہگورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال۔

لوگ اٹھ اٹھ کر ہاتھ باندھ کر ان کے گھٹنوں اور چرنوں کو چھوتے رہے اور وہ انہیں

OCIETY.COM

منع کرنے کی زحمت کا بوجھ اٹھائے بغیر ایک سنیچو سمان کھڑے رہے۔ جب لوگ چھٹ گئے تو وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "اب کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "میں کیا حکم دے سکتا ہوں سرکار۔ ایک عرض ہے کہ آج آپ میرے ساتھ چلیں۔ میرے غریب خانے پر قیام فرمائیں اور صبح ناشتہ کر کے واپس آجائیں۔"

کہنے لگے "کل صبح ہمیں حسن ابدال روانہ ہونا ہے۔"

میں نے کہا "کب روانہ ہونا ہے میں ٹھیک وقت پر پہنچادوں گا..... آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔"

فرمانے لگے "کیوں نہیں کیوں نہیں شفائی۔ اول حق تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔ کچھ مجبوریاں راہ میں آجائیں تو حق تلف نہیں ہوتا وقتی طور پر بوجھ تلے آجاتا ہے۔ چلو میں تیار ہوں!"

ان کی یہ بات سن کر میرے وجود کے اندر چاند ناں سا ہو گیا اور میں نے چہک کر کہا "آپ کا سامان؟"

بولے "ایک بیگ ہے۔ وہ سیوادار کے پاس رہے گا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

WWW.PAKS

۲۱

جب ہم گھر پہنچے اور میں نے اپنی بیوی سے ان کا تعارف کرایا تو اس نے کچھ خوش دلی سے ان کا استقبال نہ کیا۔ مجھے اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی۔ انہیں اس برتاؤ کا یقین تھا۔ مسکرا کر کہنے لگے "شفائی آپ کی بڑی تعریفیں کرتا تھا لیکن مجھے اس کی بات کا کچھ ایسا یقین نہیں تھا۔ اب جو آپ سے ملا ہوں تو بات شیشہ ہو گئی ہے....."

یہ کہہ کر وہ ذرا رکے کہ شاید میری بیوی اس کے جواب میں کوئی روایتی نا نہہ نو نہہ کرے لیکن وہ اسی طرح چپ گڑپ ناراض بلی کی طرح صوفے پر بیٹھی رہی۔ استاد مکرم نے اچھے سجاؤ اور خوش خلقی کی چند اور باتیں بھی کیں لیکن میری بیوی نے ان کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ ان کی طرف منہ اٹھا کر کہنے لگی "گوروجی میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں' آپ ان سے باتیں کریں۔"

مرشد نے "مہربانی۔ شکریہ شکریہ" کہہ کر اور اس کے اٹھنے کے ساتھ ذرا سا اٹھ کر عزت افزائی کے انداز میں "بس جی زیادہ تکلف نہ کرنا' میں رات کو تھوڑی روٹی کھاتا ہوں۔"

میری بیوی نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں نے استاد مکرم سے کہا کہ اگر وہ ذرا دیر کمر سیدھی کرنی چاہتے ہوں تو ساتھ کے کمرے میں اپنے بستر پر دراز ہو لیں۔ میں کھانا لگنے پر انہیں اطلاع کر دوں گا تو انہوں نے کہا "نہیں' نہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور مزے میں ہوں۔ یہیں بیٹھتے ہیں۔"

میں نے کہا "سرکار ایک بات رہ رہ کر میرے دل میں اٹھتی ہے لیکن مجھے پوچھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ نہ پوچھ سکا تو دل پر عمر بھر کا بوجھ رہ جائے گا۔ آپ کا مقام اونچا ہے' میری

OCIETY.COM

ذات چھوٹی ہے....."

کہنے لگے "تخت پور کے ساتھ میرا جینا مرنا ہے۔ اس کو میں چھوڑ نہیں سکتا کہ وہاں پر میرا باپ دفن ہے اور وہ بہت ہی بزدل اور بودا انسان ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتا ہے۔ گھبرا جاتا ہے۔ یوں بھی ہم بھتری لوگ دل کے نرم ہوتے ہیں۔ بھرم کے مارے ہوتے ہیں۔ وہ تو بہت ہی بزدل اور خوف کا مارا تھا۔ میں اس کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ چھوڑ نہ سکتا تھا تو ایک روز بلوائیوں نے چوک میں پکڑ لیا کہ یا تو سکھی دھرم اختیار کرو' نہیں تو تخت پور چھوڑ کر اپنی مسلمانی دھرتی پر چلے جاؤ۔ ہم ملیچھ کو زیادہ دیر یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ میں نے کہا" لاؤ پرشاد چھک لیتے ہیں۔" انہوں نے کہا کڑا بھی پہننا پڑے گا' میں نے آستین اوپر اٹھا کر کہا' کڑا تو میرے مرشد نے کب کا ڈالا ہوا ہے۔ جھنجھلا کر بولے "کیس بھی رکھنے پڑیں گے! میں نے کہا مہینے دو مہینے میں گیسو آپ دراز ہو جائیں گے۔ تم فکر کیوں کرتے ہو۔"

"اس طرح آپ نے سکھی دھرم اختیار کر لیا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

بولے "بالکل اس طرح۔ عین اسی طرح۔ میں نے سکھی دھرم اپنا لیا۔ اگر ان کو اس بات کی خوشی تھی تو میرا اس میں کیا جاتا تھا۔"

میں نے کہا" آپ تو پہلے بھی گوردوارے جا کر ارداس کرتے رہے تھے۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی۔"

ہنس کر کہنے لگے "مجھے تو نہیں تھی لیکن ان کو شاید تھی' اس لیے انہوں نے چولا بدلنے پر زور دیا۔"

میں نے کہا" آپ کے والد تو خود رہا بے تھے' پھر انہوں نے یہ کیا حرکت کی کہ آپ کو مجبور کر دیا۔ بھائی بالی کہنے لگے "ہم اصل کے خاص رہا بے ہیں اور بھائی مردانہ سے ہمارا ننھالی رشتہ ہے۔ سکھی دھرم تو بابا کی سنگت میں ہماری وجہ سے پھیلا۔ سکھوں نے ہم کو ہی سکھ بننے کا حکم دے دیا۔ ہم نے ان کا حکم مان لیا کہ چلو یوں ہے تو پھر یونہی سہی۔"

میں نے دکھی ہو کر کہا" آپ نے کیوں مانا ان کا حکم۔ وہ کوئی آپ کے حاکم تھے۔"

کہنے لگے۔ "ان کی اچھیا تھی' ہم نے پوری کر دی۔"

میں نے کہا" کیوں پوری کر دی؟ کیا آپ ڈر گئے تھے؟"

بولے "بھئی جب مورکھ ہو تو اس کی اچھیا پوری کرنی ہی چاہیے۔ بالک' مہلا اور ہٹی کی اچھیا پوری کرنے میں ہی پن ہے۔"

وہ صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ دونوں باہیں زانوں پر تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں کنگھی ڈالی ہوئی تھی۔ میں ان سے اس سلسلے میں کچھ اور نہ پوچھ سکا۔ اصولاً مجھے پہلے بھی نہیں پوچھنا چاہیے تھا مگر میں نے حماقت کر لی تھی اور اب اس حماقت پر پریشان تھا۔ انہوں نے میرے دل کا بوجھ اور طبیعت کی پشیمانی دور کرنے کے لیے ادھر ادھر کے سوال کرنے شروع کر دیے جن میں زیادہ تر میری مالی اور اقتصادی زندگی کے متعلق تھے اور جن کی تفصیلات سن سن کر وہ ایک بزرگ استاد کی طرح خوش ہو رہے تھے۔

کھانے کا اعلان ہوا تو ہم کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔ میری بیوی نے میری کوشش کے باوجود کھانے میں ہمارا ساتھ نہیں دیا اور بڑی چالاکی کے ساتھ گرم گرم چیزیں باورچی خانے سے لاتی اور لے جاتی رہی۔ اس کے رشتے کے ایک ماموں جو اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے' وہ ہمارے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھے لیکن انہوں نے بھی نیلی پگڑی والے ایک دھان پان سکھ کو اپنے سامنے دیکھ کر نظریں جھکا لیں اور ایک لفظ بولے بغیر غپا غپ کھانا کھاتے رہے۔

جب ہم واپس ڈرائنگ روم میں آئے تو میں نے کہا "اب آپ چل کر لیٹ جائیں۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ شام کو ان سودائیوں نے اور تھکا دیا۔ کل آپ کو حسن ابدال بھی جانا ہے۔ میرا من تو لالچی ہے....."

"میرا من بھی ایسا ہی لوبھی ہے۔" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں' جب تم کو نیند ستانے لگے تو اٹھ کر چلے جانا۔"

میں نے کہا "آپ کی سنگت میں تو میں چالیس راتیں جاگ سکتا ہوں لیکن مجھے آپ کا خیال ہے۔"

فرمانے لگے "میرا خیال نہ کرو' ہم تو ان مت لوگ ہیں۔ کوئی نہ ہو تو اپنے آپ سے باتیں کر کے ہی وقت گزار دیتے ہیں۔ ہمارے لیے تو دن اور رات ایک ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کا فرمان ہے تو میں بھی بیٹھا ہوں بلکہ مجھے تو بہانہ مل گیا ہے..... آپ پاؤں اٹھا کر اس چوکی پر رکھ لیں۔"

کہنے لگے "ہمارے دھرم میں چوکی کا بڑا سمان ہے۔ گوروں کی آسنی سے اس کا اونچا مقام ہے۔ ہم اس پر پیر رکھنا تو کجا اس پر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "سر! وہ جو آپ نو دروازوں کی بات کر رہے تھے' وہ کیا تھا۔ میں نے پڑتالگا

کر دیکھا' وہاں بارہ دری کے بارہ دروازے تھے۔ مڑھی کے ساتھ دری تھی۔ اندر جانے کا ایک بڑا دروازہ تھا۔ مجھے نو دروازوں کی سمجھ نہیں آئی۔"

ہنس کر بولے "ہمارا روحانی سفر پیروں کے تلوؤں سے لے کر سر کی چوٹی تک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس سفر کی دو منزلیں ہیں۔ ایک آنکھوں تک ہے اور دوسری آنکھوں کے اوپر ہے۔ ہمارے جسم کے اندر من اور روح کی جو جگہ ہے' وہ ہماری آنکھوں کے پیچھے ہے۔ فقرا اسے نقطہ سویدا کہہ کر بیان کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "سویدا تو دل کے اوپر ہوتا ہے۔ گناہوں کی کثرت سے اس کی سیاہی بڑھتی جاتی ہے اور جب انسان....."

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا "وہ شاعروں کا سویدا ہے۔ صاحب حال فقیروں کا سویدا وہی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ رشیوں منیوں نے اس کو شویتر یا دویہ چکشو کہہ کر بیان کیا ہے۔ گورو نانک دیو جی اس کو تل یا تیسرا تل کہتے ہیں..... اگر ہم کو کوئی بات بھول جائے یا کسی بات کو یاد کرنا ہو تو ہمارا ہاتھ قدرتی طور پر خود بخود ماتھے پر ٹک جائے گا اور ہم ماتھے پر انگلی بجا کر یا ماتھا چھپا کر اسے یاد کرتے ہیں۔"

پھر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "کسی بھولی بسری چیز یا کسی بھولے بسرے واقعے کو یاد کرنے کے لیے ہم گھٹنوں پر یا پیٹ پر یا لاتوں' بیروں پر ہاتھ مار کر یاد نہیں کرتے..... آنکھوں کے درمیان پیچھے کی جگہ کا ہمارے سوچنے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہر ایک خیال یہاں سے اتر کر نو دواروں کے ذریعے ہماری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔

میں حیرانی سے ان کا چہرہ تک رہا تھا۔

انہوں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا "ہمارا خیال تیسرے تل سے اتر کر لحہ بہ لحہ ساری دنیا میں پھیلتا جاتا ہے اور من ایک سیکنڈ کے لیے بھی آنکھوں کے پیچھے نہیں ٹکتا اور جتنا عرصہ یہ آنکھوں کے پیچھے نہیں ٹکتا' اتنا عرصہ یہ من اپنے گھر ترکٹی میں جا کر نہیں سما سکتا۔"

ان کی یہ بات میری گرفت میں اس لیے نہ آسکی کہ میں ابھی تک نو دروازوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ان سے پوچھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی لیکن اُستاد بھی فہم کا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولے "ہمارے شریر کے اندر نو دروازے ہیں۔ پاؤں سے شروع کر کے اوپر کو آتے ہیں تو ٹانگوں کے اوپر رانوں کے درمیان دو دروازے ہیں۔

یہاں سر یر کھلا پڑا ہے۔"

ان کی یہ بات سن کر میں سکتے میں آ گیا۔

فرمانے لگے "اب اوپر چلو تو نہ پیٹ میں کوئی دروازہ ہے' نہ سینے میں' نہ چھاتی میں۔ گردن بھی بند ہے اور مضبوطی سے اپنی جگہ قائم ہے۔ اوپر چلیں تو ایک اور دروازہ ہے۔ منہ اوہن!!" ہنس کر بولے "دریدہ دہن" ہر وقت کھلا ہر وقت بولتا' سنتا' اگلتا ہوا' کتنے ہو گئے!"

میں نے کہا "تین!"

فرمایا "اب آگے دو اور ہیں۔ ناک کے نتھنے' تین اور دو پانچ۔ ان پانچوں کے ساتھ چہرے کے دونوں جانب پہلوؤں پر دو کان ہیں' کھلے کواڑ۔ کتنے ہو گئے؟"

"سات" میں نے کہا۔

اور ان کے اوپر دو آنکھیں ہیں۔ کسی کی کالی سیاہ' بھونرا آنکھیں' کسی کی بھوری' شربتی کسی کی نیلی کنجی۔ سات اور دو نو ہو گئے..... تو اس سر یر کے اور اس دیہہ کے نو دروازے ہیں اور ان نو دروازوں سے ہمارا خیال ساری دنیا میں پھیلتا ہے اور ساری دنیا کے وچار اور کھیل تماشے ان نو دروں کے ذریعے ہمارے وجود میں داخل ہوتے رہتے ہیں..... آپ کیسی بھی اندھیری کوٹھڑی میں جا کر کیوں نہ بیٹھ جائیں' کتنے ہی تالے کوٹھڑی کو لگے ہوں' ہمارا من وہاں نہیں ہو گا۔ سر یر کو چھوڑ کر ساری دنیا میں باہر پھیلا ہو گا۔

یہ جو ہمارے من کو دلیلیں دینے کی اور سوچنے کی عادت پڑی ہے اور جس جس طرح سے ہم خیال کی سیڑھی اور وچار کی کمندیں لگا کر ہر وقت باہر گھومتے پھرتے ہیں۔ مہاتما لوگ اس کو سمرن کرنا کہتے ہیں۔ خیال شکل کا روپ دھار کر اور وچار چتر بنا بنا کر گریاں گھماتا رہتا ہے۔ سمرن کرنے کی ہر انسان کو قدرتی طور پر عادت پڑ چکی ہے اور جس کی ہم سمرن کرتے ہیں' اس کی شکل ہماری نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ اگر بچوں کی سمرن کرتے ہیں تو ان کی شکل ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اگر دھن دولت کی سوچ کرتے ہیں تو اس کے انبار نظروں میں جھولنے لگتے ہیں۔ اگر گھر کے کاروبار کا خیال آتا ہے تو گھر کے کاروبار آنکھوں کے آگے پھرنے لگتے ہیں۔ گیانی لوگ اس کو دھیان کرنا کہتے ہیں۔

اب گورو مہاراج ہم کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی بندیا! سمرن اور دھیان کی عادت تو تم کو قدرتی طور پر پڑ چکی ہے اور تم اس سے بندھ چکے ہو تو پھر اس قدرتی عادت سے فائدہ اٹھاؤ

OCIETY.COM

..... دنیا کی فانی اور مٹ جانے والی چیزوں کا سمرن کر کے ہم ان سے پیار محبت ڈالے بیٹھے ہیں اور ان میں سے کسی نے ہمارا ساتھ نہیں دینا تو پھر کیوں نہ ہم اس مالک کے نام کا سمرن اور دھیان کریں جو کبھی فنا نہیں ہوتا اور جس کی طرف ہم کو بالآخر لوٹ کر جانا ہے اور جس کی حضوری میں ہم کو ابدیت کا جگ بتانا ہے۔

پھر انہوں نے رک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے "گیانی گرنتھی بھی شبدوں کا مارا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو اس مارگ کے سوا اور کسی راہ کا علم نہیں ہوتا۔ بنا پوچھے' بنا سوچے۔ اسی راہ پر بھاگنے لگتا ہے۔ میں بھی ابھی مورکھوں کی طرح اس بات پر چل نکلا..... چلو کوئی اور بات کریں!

"ناں ناں سرناں" میں نے چلا کر کہا "اور باتیں تو اوروں سے بھی ہو سکتی ہیں' پر یہ چنگی تو آپ سے ہی مل سکتی ہے۔ مجھے تو اس دن کا بڑی دیر سے انتظار تھا کہ دنیاداری کی سمرن کو کس طرح چھوڑا جائے اور اس انہاک سے کیسے نکلا جائے؟"

انہوں نے مجھے اس استفسار میں سنجیدہ جان کر کہا "دیکھ شفائی! ہمیں سمرن کرنے کی اور خیال کی تکرار کی عادت تو قدرتی طور پر پڑی ہوئی ہے اور اس ورد میں دنیا ہی دنیا سمائی ہوئی ہے۔ اب اس کو ذرا سا پھسلا کر اور بلیات کھسکا کر چھوٹا سا کانٹا بدل لینا ہے۔ اس سمرن میں دنیا کی جگہ مالک کے نام کو من میں لگانا ہے۔ اگر ہم اس مالک کے نام کا دھیان اور سمرن کریں جو کبھی فنا نہیں ہوتا تو ہمیشہ کے لیے ہم ان سنساری بندھنوں سے چھوٹ جائیں۔"

لیکن یہ ہو کس طرح ہے؟" میں نے پوچھا "اس کی مکینکس اور اس کی ڈرل کیا ہے اور کون طریقہ اپنا کر اس سمرن کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔"

انہوں نے کہا "پہلے تو اپنے وجود کے نو کے نو دروازے بند کرنے ہیں۔ من کو شانت کر کے آنکھ کے پیچھے اپنے خیال کو ٹکانا ہے۔ پھر اس مالک کی سمرن کر کے اپنے پھیلے ہوئے خیال کو سمٹا کر آنکھوں کے پیچھے یکسو کرنا ہے۔"

میں نے کہا "حضور یہی تو مشکل عمل ہے جس کے آگے بڑے بڑے پیر' فقیر اور صوفی عاجز ہیں۔" جھٹ سے بولے "ناں ناں! یہ تو اتنا سادہ اور آسان طریقہ ہے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک سب اس کو آسانی سے کر سکتے ہیں۔"

"لیکن.....!" میں نے بات کاٹ کر کہا تو انہوں نے بھی اسی قدر زور سے کہا "لیکن من اس جگہ ٹکتا اور ٹھہرتا نہیں۔ اس کو بار بار تو دروازوں سے باہر دوڑنے کی عادت پڑی

ہوئی ہے۔ کوشش کے باوجود کھٹاک سے بھاگ جاتا ہے۔ کوئی دید کا مشتاق ہے' آنکھیں سینکنے کا ٹھرکی ہے۔ نظارے کا شوقین ہے' آنکھوں کے کواڑ کھول کر باہر کو جائے گا۔ کسی آواز سے لگاؤ ہے۔ سر سے عشق ہے۔ درد بھری بات سننا چاہتا ہے' آواز دے کر جواب مانگتا ہے۔ کانوں کے دروازے کھول کر سڑک پر آگیا ہے۔ اب کون اسے اندر لے جائے اور واپس لے جا کر یکسو کرے۔ پھر زبان کا چسکا ہے۔ بول بچن کا ذائقہ ہے۔ ہونٹوں کی تپش ہے اور اب دین کی کشش ہے۔ ایک بار دروازہ کھول دیا تو سارا وجود باہر آگیا۔ گلی میں آوارہ گردی کرتے کرتے شہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا.....

اسی طرح باسنا ہے۔ بوئے پیراہن ہے۔ بدن کی خوشبو ہے۔ بوئے گلاب۔ انناس اور پیاس کی ملی جلی خوشبو ہے۔ اس دروازے کا نکلا ہوا خیال کدھر سے گھیر کے لاؤ گے..... اور وہ جو نیچے کے دروازے ہیں..... "انہوں نے شرم سے سر جھکا کر کہا" ان کی کیا تفصیل بیان کروں۔ تم پڑھنے لکھنے والے آدمی ہو۔ لٹریچر نے سارے سٹال انہی دروازوں کے ساتھ لگائے ہیں۔ تم میرے سے زیادہ جانتے ہو۔ تم مجھ سے بہتر پہچانتے ہو۔ یہاں میں نابینا ہوں اور تم بینا ہو۔ سمجھ چکے ہو' زیادہ دیکھ چکے ہو' پہچان چکے ہو اور بہت سوں سے بہتر جان چکے ہو۔ من کو خلا میں کھڑا کرنا بہت مشکل ہے۔"

"یہی تو میں عرض کر رہا ہوں۔" میں نے اترا کر کہا" اسی سوال کا تو جواب مانگتا ہوں کہ من کو خلا میں کیسے کھڑا کرے اور خیال کو کونسی زنجیر پہنا کر ساکت کرے۔"

کہنے لگے "یہاں مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ گورو کی' ست گورو کے ساتھ ادھکتا ہوتی ہے۔ یہاں کسی کے سروپ کا دھیان دینا بڑا لازمی ہے۔ اس کو تصور شیخ کہتے ہیں۔ اس مقام پر مالک کے بھگتوں اور پیاروں کی کھوج کرنی ہے۔ ان پیاروں کی کھوج جن کا تعلق اس سے جڑا ہوا ہے۔ یہ وہی انعام یافتہ لوگ ہیں جن کو قرآن شریف انعمت علیھم کہہ کر پکار رہا ہے..... گورو نانک دیو جی فرماتے ہیں:-

گورو کی مورت من میں دھیان
اور اکال مورت ہے سادھ سنگن کی' ٹھاہر نیکی دھیان کو

اس دھیان کے ذریعے ہمارے خیال کو آنکھوں کے پیچھے ٹھہرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ دھیان تو ہم اپنے ستگورو کا کرنا ہے' اپنے مرشد کا کرنا ہے جس نے ہم کو مالک کی بھگتی کا طریقہ اور راستہ بتایا ہے۔ جب مرشد کے ساتھ تعلق گہرا ہو جاتا ہے اور وہ یکسو ہونے میں

OCIETY.COM

ہماری مدد کرتا ہے تو ہمیں آنکھوں کے پیچھے اور میٹھی سریلی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ ایک باجہ بجنے لگتا ہے۔ جسے فقیر لوگ انھد باجہ کہتے ہیں۔ بانگ آسمانی کہتے ہیں۔ کلام الٰہی 'ندائے سلطانی اور اسم اعظم کا نام دیتے ہیں۔"

وہ اپنی ترنگ میں بول رہے تھے اور میں ان کے سامنے گم سم' چپ چاپ' مبہوت ان کی باتیں سن رہا تھا۔

کہہ رہے تھے "مولوی ہمیشہ محراب کے اندر کھڑا ہو کر بانگ دیتا ہے۔ ہمارے ماتھے کا انداز بھی محراب جیسا ہے جو مالک کی درگاہ کی طرف سے قدرتی حکم آرہا ہے' وہ اسی محراب یعنی ماتھے کے اندر آرہا ہے۔ جس وقت اس کی آواز' اس کا کلمہ یا اسی اسم کو پکڑتے ہیں تو ہم اس آواز کے پیچھے پیچھے چل کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔"

منزل مقصود تک پہنچ کر اچانک رکے اور شفقت سے کہنے لگے "تمہیں نیند آرہی ہے۔ اب سو جاؤ' باقی باتیں صبح کریں گے۔"

میں نے کہا "بالکل نہیں حضور' ہرگز نہیں۔ میں نے تو آنکھ تک نہیں جھپکی۔ آپ البتہ ضرور تھک گئے ہیں۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے' انھیں آپ کا بستر ساتھ کے کمرے میں لگا ہے۔"

انہوں نے ذرا سی گردن گھما کر ساتھ کے کمرے کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے "اگر تم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہیں' اسی جگہ سو جاتا ہوں' اسی صوفے پر۔"

"اس صوفے پر! بیٹھے بیٹھے!! یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔ آپ چل کر بستر میں آرام فرمائیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

ہنس کر بولے "اب کسی چیز کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔ آرام میری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہر وقت آرام میں رکھتا ہے۔"

میں نے کہا "اٹھئے۔ تھوڑی دیر آرام کر لیجئے۔ پھر پتہ نہیں آپ لوگ کب اٹھ کر کیا کرتے ہیں اور کتنی دیر تک کرتے ہیں۔ یہ کرتو یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔"

"میرا کرتو یہ" سن کر مسکراتے ہوئے اٹھے اور ننگے پاؤں دوسرے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں نے ان کے پیچھے جا کر کہا "یہ آپ کا نائٹ سوٹ ہے۔ سفید دھوپی کی دھلی دھوتی' کھدر کا تازہ سلا کرتہ۔ سر پر باندھنے کا رومال اور ربڑ کے سلیپر....."

کہنے لگے "واہ جی واہ یہ تو موج ہو گئی۔ ایسے صاف ستھرے دستر بڑی دیر بعد دیکھنے کو

ملے۔ تم اب جا کر سو رہو' صبح ملاقات ہو گی۔"

میں نے کہا "ناشتہ کب کریں گے؟"

بولے "جب تم کرو گے' تمہارے ساتھ ہی کر لوں گا لیکن ذرا جلدی ہو کہ کل جتنے کو حسن ابدال روانہ ہونا ہے۔"

میں نے کہا "جو حکم..... جس وقت اٹھیں گے' ناشتہ تیار ملے گا۔"

کہنے لگے "ٹھیک ہے۔"

میں چلنے لگا تو بولے "یار وہ کیمرہ رہ گیا' اس کی بڑی ضرورت تھی۔"

میرے دل میں تو آئی کہ ایسی کڑی ضرورت کی تفصیل سے آگاہی حاصل کروں لیکن ان کے مقام کی وجہ سے رک گیا اور سر کھجاتے ہوئے بولا "وہ اگر آپ وہاں حسن ابدال میں کوشش کریں گے تو آپ کو ضرور مل جائے گا۔ ان دنوں روسی حملے کی وجہ سے بہت سے افغان سوداسلف پیچھے پنڈی تک آتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا سامان ہوتا ہے۔ کیمرے بھی دیکھے ہیں۔ حسن ابدال میں ضرور مل جائیں گے۔"

کہنے لگے "روسی ساخت کا چاہیے' وہ جو انہوں نے جرمن کیمرے کی نقل میں بنایا ہے۔ بھائی گوردت سنگھ کے پاس ہے۔ بہت اچھا فوٹو کھینچتا ہے' بالکل جرمن کیمرے کا لگتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں' وہاں مل جائے گا۔ سڑک کنارے دورویہ دکانیں ہیں' وہاں اسی قسم کا مال ملتا ہے۔ خریداری پر بھی کوئی پابندی نہیں۔"

کہنے لگے "مل ہی جائے تو اچھا ہے۔ بڑی دیر کی اچھیا تھی' پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔"

میں نے کہا "آپ فکر ہی نہ کریں۔ کوئی اتنی بڑا اچھیا نہیں جو پوری نہ ہو سکے۔ حسن ابدال میں نہ مل سکا تو ہم پشاور ہاڑے سے جا کر خرید لیں گے۔"

کہنے لگے "ٹھیک ہے۔ مگر وہ پشاور ہاڑے کا مطلب اچھی طرح سے نہ سمجھ سکے کہ وہاں کیسے جائیں گے اور کس کو کہیں گے اور کدھر سے خریدیں گے۔"

صبح جب میں ان کو جگانے کے لیے ان کے کمرے میں گیا تو وہاں موجود نہیں تھے۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا اور ان کے مدھر سروں کی آواز ڈرائنگ روم سے آ رہی تھی۔

رات میں جس صوفے پر ان کو چھوڑ گیا تھا' وہ وہیں بیٹھے تھے اور دھیمے سروں میں کوئی پرارتھنا کر رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر ان کے کمرے میں دیکھا' بستر اسی طرح لگا ہوا تھا۔ ان